Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 5, Issue 2
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

نگہت نورین
اسکالرپی ایچ ڈی اردو نمل اسلام آباد

بیسویں صدی کے پاکستانی اردو ناول میں سیاسی استحصال

Nighat Noreen
Scholar Ph.D Urdu NUMLl Islamabad

Political Exploitation In Pakistani Urdu Novel Of The Twentieth Century

The novel is a mirror of social history. It represent era, place and cultrate, novel has a unique status in Urdu literature. It is a reflection of human society. Novel has interpreted different race and values.As you know, the politics is an important institution of state whose active roles lead to the development of country, otherwise corruption leads to the decline, and the common men considers helpless under the oppression of the state as a result his positive thinking becomes negative.

KeyWords:Politics,Exploitation,Dictatorship,PakistaniNovel,20th Century.

کلیدی الفاظ: سیاست، استحصال، آمریت، پاکستانی ناول، بیسویں صدی

تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو بیسویں صدی سائنسی ایجادات وانکشافات، علمی وادبی سیاسی اور سماجی رجحانات کی صدی قرار پاتی ہے۔ صدی کے ابتدائی ادوار ہی میں اسلامی دنیا ثقافتی اور سیاسی اعتبار سے بحران کا شکار ہوتی دکھائی دی جانے لگی۔ طاقتوں کا عروج بڑھا اور سلطنت عثمانیہ روبہ زوال ہونے کے بعد یورپ کی سلطنتوں سے خراج پاگئی ۔جنگ عظیم اول کے بعد ایشیا میں بھی یورپی حکمرانوں کے اقتدار کے حوالے سے خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی۔ جنوب مشرقی ایشیا کے مسلم ممالک مغربی طاقتوں کے شکنجے میں آچکے تھے۔ ہندوستان میں برطانوی راج کا سورج دکھائی دیا جانے لگا۔ ایسے میں سرسید کی اصلاحی تحریک کے رد عمل کے طور پر رومانوی رجحانات نے جنم لیا۔ نئے سیاسی حالات اور سماجی اقدار نے نئے اذہان وادب کو تخلیق کیا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں جدوجہد آزادی میں اضافہ ہوا ۱۹۲۰ء میں کانگریس نے مکمل آزادی کا نعرہ لگایا۔ دوسری عالمی جنگ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ سرمایہ داری نظام کو تقویت مل رہی تھی۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا تبدیلی کے زیر اثر دکھائی دی جانے لگی ایسے حالات میں تشکیل دیا جانے والا ادب انھی حالات کے زیر اثر تخلیق پایا جانے لگا۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک وجود میں آئی۔ اس کے زیر سایہ ایسے موضوعات کا ادب میں خیر مقدم کیا گیا جو زندگی کی حقیقتوں پر مبنی تھے۔ ترقی پسند تحریک کی فکری بنیاد سیاست پر تھی۔ اس بنا پر ایسا ادب تخلیق کیا گیا جس کا تعلق سیاست سے ہو اور سیاسی مسائل کی تشریح بھرپور طریقے سے کی گئی ہو۔ ہنس راج رہبر کے بقول:

"سیاست اور سماج میں بڑا گہرا تعلق ہے اگر ادیب یا شاعر کا سماجی نقطہ نظر صاف اور واضح نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا سیاسی نقطہ نظر بھی صاف نہیں ہوگا۔"(۱)

اردو ناول نگاری کو موضوعاتی تناظر میں دیکھا جائے تو بیسویں صدی کے آغاز ہی سے اس میں سیاسی رنگ کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ سیاست انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ انسانی سماج کا ایک لازم جزو ہے۔ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں کئی بڑے نام سامنے آتے ہیں۔ جنھوں نے سیاسی موضوعات کو اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ ان میں پریم

چند، حیات اللہ انصاری، عبداللہ حسین، جوگندر پال، عزیز احمد، شوکت صدیقی، راجندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر خالد سہیل وغیرہ سر فہرست ہیں۔ پاکستان میں سب سے ناکام کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والا ادارہ سیاست کا ہے۔ ابتدائے پاکستان سے آج تک اس ادارے کی کارکردگی میں ذرا برابر بہتری دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ذاتی اور پارٹی مفادات ہمیشہ ملکی مفادات پر سبقت لے جاتے رہے۔ تحقیق کے بعد اس ادارے کی اس قدر مخدوش کارکردگی کے حوالے سے کئی وجوہات سامنے آتی ہیں۔

اول تو یہ کہ اس ملک کا انتظام ایسے سیاست دانوں نے سنبھال رکھا ہے جو تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ حکومت جن وزراء کو ادارے کا اختیار تفویض کرتی ہے۔ وہ اس محکمہ کی دیکھ بھال کا اہل نہیں ہوتے۔ اس کی تعلیمی اسناد کا متعلقہ محکمہ سے کمی کا شکار ہونے کی بنا پر وہ اس ادارے کے نظم و نسق کے حوالے سے کوئی وژن نہیں رکھتا۔ موروثی سیاست کا رجحان ہمارے ملک کے نظام سیاست کی تباہی کی ایک بڑی وجہ بنتا ہے۔ سیاسی پارٹیاں شخصیات کے گرد گھومتی رہتی ہیں۔ مخصوص افراد اپنی خاندانی پارٹی کی قیادت کرتے ہیں۔ اور اپنی مرضی و منشا سے پارٹی کی باگ دوڑ سنبھالتے ہیں۔

تیسری بڑی وجہ جاگیر داروں اور سیاست دانوں کا انسلاک ہے۔ جتنا بڑا جاگیر دار ہو گا وہ اتنا بڑا سیاستدان بن کر سامنے آتا ہے ۔ ملکی سیاست کو جاگیر کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔ ذاتی پسند و ناپسند اور نتائج کے حصول کے واسطے حکومت غیر آئینی اقدامات کو سر انجام دیتی ہے۔ چوتھی بڑی وجہ جمہوری نظام میں ڈکٹیٹر شپ کا داخلہ ہے۔ ایک تسلسل کے ساتھ ملکی تاریخ میں نظام حکومت سیاستدانوں کے پاس کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ جس کی بنا پر اس ادارہ میں کوئی اصول و ضوابط، نظم و نسق اور جمہوری اقدار فروغ نہیں پا سکیں۔ درجہ بالا چند بنیادی وجوہات کی بنا پر اس ادارے کی کارکردگی مایوس کن صورتحال کو پیش کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ناول نگاروں نے ناولوں میں دیگر سماجی اداروں کے مسائل کے ساتھ ساتھ سیاست کے مسائل کو بھی اپنے ہاں جگہ دی ہے۔ اس ادارے کے جبر اور ظالمانہ اقدامات سے انسانی زندگی کس قدر متاثر ہوتی ہے ان تمام وجوہات کو ناولوں کا حصہ بنا کر بھرپور انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

'دیوار کے پیچھے' ۱۹۸۰ء میں انیس ناگی کا چھپنے والا ناول انسان کے سیاسی استحصال کو بیان کرتا ہے۔ انیس ناگی نے مکر و فریب کی غلاظت سے بھرے تعفن زدہ سماج کے حالات کو بیان کیا ہے۔ جس میں ایک عام انسان معاشرے میں ہر سو پھیلی برائیوں سے اپنا دامن بچانے میں ناکام رہتا ہے۔ بھرپور جاگیر دارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ نظام کے مظاہرات کے پروردہ سماج میں انسانی استحصال سیاسی سطح پر اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ یہاں ریاستی مشینری معاشرے کے عام افراد کو اپنی جابرانہ دہشت سے ہراساں کیے رکھتی ہے یہ ایسا سماج ہے۔ " جہاں دیوار کے پیچھے وہ تمام سازشیں فروغ پاتی ہیں جو فرد کی انفرادیت اور آزادی کو سلب کر کے اسے انبوہ کے درمیان بے نام و نشان زندگی گزارنے پر مجبور کرتی ہیں۔ "(۲)

سماج میں مختلف طبقہ ہائے فکر کے افراد پائے جاتے ہیں۔ ذکی الحس، بیدار مغز اور باشعور انسان کا طبقاتی معاشرے میں پیدا ہونا اس کے استحصال کی بنیادی وجہ بن کر سامنے آتا ہے۔ صادق اور صاف گو انسان کی متضاد رویوں کے حامل معاشروں میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ سماج میں پھیلے ناسوروں میں مکر و فریب، فسق و فجور اور لاقانونیت کا ادراک رکھنے والا انسان کبھی قابل قبول نہیں ہوتا۔ ناول 'دیوار کے پیچھے' کا مرکزی کردار معاشرے کے غیر فعال سیاسی اداروں کے منفی رویوں کے تدارک کے نظریات رکھتا ہے۔ اس بنا پر اس کا وجدان ہی اس کے استحصال کا موجب بنتا ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین درویش کردار کے المیاتی پہلو کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

" مرکزی کردار کا المیہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف اس تمام سیاسی، سماجی، ریاستی اور تمدنی بگاڑ کی خبر رکھتا ہے۔ بلکہ اس کے تدارک کے لیے ایک خاص نقطہ نظر بھی رکھتا ہے۔"(۳)

پروفیسر ایک نظریاتی شخص ہے۔ جس کے مطابق معاشرے پر جمود طاری ہے۔ اور اس کی ترقی کے قدم رک چکے ہیں۔ اور جمود کی اس فضا میں تبدیلی تب ہی ممکن ہے جب ریاست اجتماعی حیثیت سے اس کی تبدیلی کے لیے جدوجہد کرے گی۔ ریاستی جدوجہد کے الفاظ استعمال کر کے وہ ریاستی جبر کو آواز دیتا ہے۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ اس سے خوفزدہ رہتی ہے۔ اور بالآخر بے بنیاد الزامات لگا کر اس خوف کے طوق کو اتار پھینک دیا جاتا ہے۔ اپنی جہالت اور بدعنوانیوں کو تحفظ دینے کے لیے طالب علموں کو اس کے سامنے لا کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس کے شاگرد اسے سُر خاسُر خا کہہ کر پکارتے ہیں۔ سرکاری ایجنسیوں کے افراد اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس کی زندگی دوبھر کر دیتے ہیں۔ انسانوں کے جذبات و احساسات کے بیوپاری سیاسی قائدین اسے اپنے لیے خطرہ تصور کرتے ہوئے نکیل ڈالنے کی سعیٔ کرتے ہیں۔ اور اسے شاہی قلعہ کے عقوبت خانہ میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

استحصال زدہ ایسا معاشرہ جس کی جڑوں میں منافقت، جھوٹ، مکر و فریب، مادیت کا غلبہ، کینہ پروری، ضمیر مردگی اور انتقام جیسی امراض سرائیت کر چکے ہوں۔ وہاں پروفیسر جیسا نیک نیت انسان حق کا متلاشی ہی رہتا ہے۔ اس کا سفر حق اسے پاتال میں دھکیل کر اس کینہ پرور معاشرے کو کندھا دیتا ہے۔ استحصال کی حد اگر ایک شخص سے زیادتی پر آکر رک جاتی تو اور بات تھی۔ یہاں غم و غصہ ابدی صورت اختیار کرتا ہوا سماجی روابط اور رشتوں کو زک پہنچاتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ المیہ اندوہناک اس وقت بنتا ہے۔ جب اس کے افراد خانہ بھی اس سے نالاں رہنے لگتے ہیں۔ ہونا بھی چاہیے۔ آخر ان کی زندگیوں کو ابتر بنانے میں پروفیسر کی حق گوئی شامل تھی ۔ دونوں بہنیں بن بیاہی رہ جاتی ہیں۔ اس کی حق گوئی کہ بہن کو مرگی کے دورے پڑتے ہیں۔ انسانیت کی حقیقت کو سامنے لاتی ہے۔ ایسے میں بہنوئی درد دل کی بجائے سکون ذات کو اہم گردانتے ہوئے رشتے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس نے سچ بولا تو بربادی دیکھنے کو ملی۔ چھوٹی بہن، بھائی کے ریاستی سطح پر تبدیلیوں میں غیر فعال رکن کی حیثیت سے کردار نبھانے کے باعث باپ کی دہلیز پر بن بیاہی بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح چھوٹا بھائی اپنی بیرون ملک جانے کی خواہش کو اپنے اندر ہی دفن کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جبر و استبداد کی اس کیفیت میں پروفیسر اپنے کردار کو نیا موڑ دیتا ہے۔ وہ اپنی کایا کلپ کرتا ہے۔ وہ اپنے ظاہر اور باطن میں تضاد کی کیفیت کو فروخت دیتا ہے۔ معاشرے کو وہ نیک نیت پسند نہیں تھا۔ اس نے جھوٹ اور مکر و فریب کا لبادہ اوڑھ کر خوب دولت سمیٹی۔ یہ غیر قانونی اور غیر اخلاقی افعال جو آج وہ اپنائے ہوئے تھا۔ اس کے جزوذات ہرگز نہ تھے۔ یہ تو ریاستی جبر کی ضرورت تھی۔ اور اپنانا اس کی مجبوری۔ ریاست کے عام باشعور شہری کے استحصال کی عمدہ مثال پروفیسر کا کردار ہے۔ ریاستی باشندے اپنی کمزوریوں کے تدارک کا نظریہ رکھنے والے انسان کو کس طرح اپنی راہ کا مسافر بنا لیتے ہیں۔ اس ناول میں بخوبی دکھایا گیا ہے۔

"دیوار کے پیچھے ایک ایسی ریاست ہے جہاں ظلم، بے روزگاری، تنہائی، بے بسی، بیزاری اور ابن الوقتی کا ایک طویل سلسلہ ہے۔"[۴]

انور سجاد کا ناول 'خوشیوں کا باغ' اسی کی دہائی میں سامنے آیا۔ پورے ناول میں سیاسی رجحان کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ یہاں سیاست کا رویہ ایکشن کے طور پر نہیں بلکہ احساساتی سطح پر اظہار پاتا ہے۔ مصنف کے نزدیک عام انسان کی حالت ابتری کی وجہ صاحبان اقتدار ہیں۔ جو اپنی حرص و طمع میں اس قدر خود غرض ہیں کہ انھیں عام انسان کی حالت زار دکھائی تک نہیں دیتی۔ انور سجاد اپنے ناول کی نسبت ایک معروف مصور "بوش" کی تصویر "خوشیوں کا باغ" علامت کے طور برتتے ہوئے بے انصافی، لاقانونی اور انتشاری صورتحال کو اپنے معاشرے میں دکھانے کی سعیٔ کرتے ہیں۔

"بوش" نے تصویر کے ذریعے زمانی حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کی۔ جب مسیحائی عدالتیں سچ بولنے والوں کو جادوگر اور شیطان کے تماشے قرار دیتے ہوئے زندہ جلائے جانے کی سزا دیتی تھیں۔ ریاستی جبر کی بدولت ایک چیف اکاؤنٹنٹ داخلی و خارجی دونوں سطحوں پر مسائل کا شکار دکھایا گیا ہے۔ اس کی ذاتی زندگی بھی مسائل کا شکار ہو جاتی ہے۔ عالمی طاقتوں کا بڑھتا ہوا استبدادی شکنجے کا اعلیٰ ملٹی نیشنل کمپنیوں کا قیام ہے یہ انسان کو محدود وسائل مہیا کر کے ان کا بھرپور استحصال کرتی ہیں۔ اقتباس:

"ایم ڈی کی سیکرٹری ایک بند لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیتی ہے۔ یہ میری سبکدوشی کا خط ہے"۔[۵]

اس بات سے ہم سب بخوبی واقف ہیں کہ پہلے عالمی طاقتیں تیسرے درجے کے ممالک میں مخصوص معاشی و اقتصادی بحران پیدا کرتی ہیں۔ پھر اپنی مرضی کی شرائط پر انھیں قرضہ فراہم کر کے غلامی کا طوق ڈال دیتے ہیں۔ اقتباس:

"اس ہاتھ سے اگر آپ کو دیتے ہیں۔ تو دوسرے ہاتھ سے اصل زر بمعہ سود در سود وصول کر لیتے ہیں۔ اور آپ کو اپنے وسائل پر قدرت حاصل کرنے والی جدید ٹیکنالوجی کی طرف دیکھنے بھی نہیں دیتے۔"[۶]

۱۲۴ صفحات پر مشتمل اس ناول میں انور سجاد نے معاشرے میں ملکی اور عالمی سطح پر تمام استحصالی قوتوں کے عزائم اور جبر و تشدد کے اثرات کا منظر نامہ بیان کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ عالمی طاقتیں تیسری دنیا کے ممالک کو اپنا ذہنی اور معاشی غلام بنا لیتی ہیں۔ ممالک اور اس کے باشندے تاریکی کے گڑھے کی مانند ہو جاتے ہیں جہاں کچھ نہ دکھائی دیتا ہے نہ عقل کام کرتی ہے۔ ڈاکٹر عارف کے بقول:

"یوں لگتا ہے کہ تیسری دنیا بے کراں تاریکی کا گڑھا ہے۔ زندگی اور اس کی امید بے انت پستی میں غرق ہے۔ کون ہے؟ کہاں ہے؟ میں بھی ہوں کہ نہیں؟ صبح کی روشنی میں کچھ بھی نہیں۔"(۷)

عبداللہ حسین کا ناول "باگھ" ۱۹۸۲ء میں خوف اور دہشت کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ مصنف نے ناول کے ذریعے ریاستی اداروں کے جبر و تشدد کی چکی میں پستی عوام کی بیچارگی کا احوال بیان کیا ہے۔ اقتباس:

"بے عملی سے ہم شکار بنتے ہیں اور عمل سے قاتل"(۸)

مصنف نے ایک جملہ میں عوام کی مظلومیت بیان کر دی ہے۔ جنرل ضیاء الحق کا دور جو تمام ڈکٹیٹروں سے زیادہ سخت گنا جاتا ہے۔ جب عوام کے اظہار پر سخت پابندیاں تھیں۔ خفیہ ادارے عام افراد کو اپنے قبضے میں لے لیتے تھے اور گمشدہ افراد کی تعداد قدرے زیادہ ہونے لگی تھی۔ ایسے میں عبداللہ حسین نے ناول تخلیق سے تیس برس قبل تخلیق کیا تھا۔ ناول میں دو متوازی موضوعات پائے جاتے ہیں۔ محدود سطح پر اس میں دو نوجوانوں کی محبت کی سرگزشت جبکہ وسیع سطح پر فوجی امروں کا اظہار ملتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار انیس بیس سال کا نوجوان اسد ہے۔ جو کہ دمہ (ضیق النفس) کے مرض میں مبتلا ہے۔ علاج کی غرض سے کشمیر کے گاؤں "گم شد" کا سفر اختیار کرتا ہے۔ وہاں ایک طبیب کی شہرت تھی۔ علاج کی غرض پوری ہو جانے کے بعد بے سہارا ہونے کی بنا پر اسی طبیب کے ہاں مستقل سکونت اختیار کر لیتا ہے۔ اسد کے علاوہ بھی دو شاگرد وہاں قیام پذیر تھے۔ حکیم کی بیٹی یاسمین اس دوران میں اسد سے مراسم بڑھاتی ہے۔ اور دونوں میں محبت جیسے لطیف جذبات پروان چڑھنے لگتے ہیں۔ دن گزرتے رہے اور ایک دن حکیم صاحب پُراسرار انداز میں قتل کر دیے جاتے ہیں۔ پولیس بنا تصدیق کے اسد کو قتل کی پاداش میں گرفتار کر لیتی ہے۔ طاقت اور تشدد کا پرزور استعمال کر کے اقبال جرم پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اقتباس:

"اقبال جُرم کر رہے ہو؟

کیسا اقبال جرم؟

کہ تو نے اپنی ماں کے ساتھ زنا کیا ہے اور کیسا

.........میں نے کیا کیا ہے؟ اسد نے پوچھا "اس بڑھے کا قتل کیا ہے"

نہیں آپ لوگ مجھے زیادہ سے زیادہ پیٹ سکتے ہیں۔ گالیاں دے سکتے ہیں مگر مجرم قرار نہیں دے سکتے۔"(۹)

ریاستی اداروں کا غاصبانہ انداز عجب تحقیر آمیز رویے کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ جو لوگوں کے جان و مال کے محافظ ہوتے ہیں ایک شریف النفس انسان کو گنہگار بنانے میں مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں۔ اسد اپنی بے گناہی کے لیے بارہا تقاضا کر چکا کہ اسے عدالت میں پیش کیا جائے۔ اور ہے تو ثبوت پیش کیے جائیں۔ لاوارث اور غربت اس کے قاتل ہونے کی بڑی وجہ بنتے ہیں جس کو وہ سمجھ نہیں پاتا۔ اسی لیے مخبر حضرات اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کہ وہ گمشدہ ہے اسے کسی نے گرفتار کیا یا نہیں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تھانے کی صعوبتوں کے بوجھ تلے دبا اسد اب ایجنسیوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جو اسے کشمیر لے جا کر آپریشن میں شامل کر کے اس کی شناخت یعنی نام تک بدل دیتے ہیں۔ اب علی کے نام سے پکارا جانے والا اسد موقع پا کر فرار ہو جاتا ہے۔ اور محض دو دن "گم شد" میں گزارنے کے بعد پراسرار انداز میں خچر پر لاد کر دوبارہ کشمیر لے جایا جاتا ہے۔

"یہ باگھ نہایت معنی خیز علامت ہے۔ اس فوجی ڈکٹیٹر کی جو کمزور اور امن پسند عوام کو مستقل خوفزدہ رکھتا ہے۔ تاکہ اپنے اقتدار کو محفوظ رکھ سکے۔"(۱۰)

صدیق سالک کا ناول 'پریشر ککر' ۱۹۸۳ء میں تخلیق ہوا۔ مجموعی طور پر صدیق سالک نے ناول میں بڑی ہنرمندی سے سماجی گھٹن اور آمرانہ جبر و تشدد کے خوفناک سائے منڈلاتے دکھائے ہیں۔ جو ایک آرٹسٹ کی بے بسی اور بیچارگی کا نوحہ بیان کرتے ہیں۔ جابرانہ اقدام ایک آرٹسٹ کی زندگی کو زنگ آلود عناصر کی مانند کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ سماجی گھٹن اس کا جینا دوبھر کر دیتی ہے۔ رنجیدہ ہو کر جنگلوں میں نکل جاتا ہے۔ آلات پینٹنگز نظر آتش کر دیتا ہے۔ اس کی بے پناہ مثبت صلاحیتوں والی زندگی کو شیطانی

چالوں کی بدولت تباہ کر دیا جاتا ہے۔ وہ اعلان کرتا ہوا دور جنگل میں نکل جاتا ہے۔ اقتباس:

"جیت گیا، جیت گیا، نکل گیا، لے لیا بدلہ میں نے، لے لیا، پاگل ہیں سارے، بے وقوف، کیا کر لیں گے میرا، کیا بگاڑ لیں گے، پاگل بے وقوف کہیں کے۔"(۱۱)

ناول نگار نے آرٹسٹ پر حکومتی استبداد کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ کہ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں فنکار کا فن ریاستی جبر کا شکار ہو جاتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فائن آرٹس کا طالب علم اضافی نمبروں سے اول آنے پر جامعہ کے مطابق لیکچرر شپ کا مستحق قرار پاتا ہے۔ مگر اسے اس حق سے محروم رکھا جاتا ہے کیونکہ صدر شعبے کا تعلق بائیں بازو کے نظریات کی حامل جماعتوں سے ہوتا ہے۔ لہذا ملازمت دینا ناممکن قرار پاتا ہے۔ امریکہ اپنے استاد کے توسط سے چند کورسز کرنے جاتا ہے۔ اور واپسی پر ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرنے لگتا ہے ملازمت کے دوران اپنی تصاویر کی نمائش بھی کرواتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کو امریکہ کا ایجنٹ قرار دے کر ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا ہے۔ معاشی طور پر تنگدست یہ انسان اس قدر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ کہ اسے عام مزدور کی مانند جاگیر دار کے گھر کی دیوار پینٹ کرنے کا کہا جاتا ہے۔ وہ اپنی تخلیقات میں عوام کے مسائل کو اُجاگر کرتا تھا۔ اس لیے وہ کبھی روس کا ایجنٹ تو کبھی اسلام دشمن قرار دیا جانے لگا۔ اس کے فن کو ایک عام مزدور کے برابر حیثیت دی جانے لگی۔

'دشت سوس' جمیلہ ہاشمی کا ناول مظلومیت زدہ طبقہ کا مظہر مانا جاتا ہے۔ جن کی قیمتی جانیں ریاست کے اندھے قوانین کی نذر ہو جاتی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی عقلمند انسان اپنے نظریات و افکار کی بدولت معاشرے میں مثبت حالات پیدا کرنے کا خواہش مند ہوا تو اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ سقراط اپنے دور کا بہت بڑا فلاسفر انقلابی افکار کی پاداش میں زہر کا پیالہ پینے پر مجبور ہوا۔ گلیلیو نے سورج ساکن اور زمین کے گردش کرنے کا نظریہ دیا تو عدالت سے سمن جاری کر دیے گئے۔ برصغیر میں قرآن کے تراجم کیے گئے۔ تو مذہب کے ٹھیکے داروں نے قرآن کی بے حرمتی کے مترادف قرار دیتے ہوئے قتل کے منصوبے بنا لیے۔ گویا ذکی الحس اور ایمانی قوت سے مالا مال افراد کا ہر دور میں استحصال کیا گیا ہے۔

منصور حلاج مشہور صوفی بزرگ تھے۔ انھوں نے "انا الحق" کا نعرہ لگایا۔ ریاست نے جب عوام کا زور و شور دیکھا تو اس عہد کے گورنر کو اپنی حیثیت آئندہ حالات میں کمزور ہوتی محسوس ہوئی۔ چنانچہ اس نے منصور حلاج کو عبرت ناک انجام سے دوچار کروا دیا۔ اشرف المخلوقات کو جانوروں سے بھی بدتر موت دی گئی۔ اس کے جسم کے حصے کے ٹکڑے کر کے بعد میں اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

"خواب گر" الطاف فاطمہ کا ناول حکومت کی استبدادی قوتوں کے کئی در واہ کرتا ہے۔ ناول ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آیا۔ ملک کے دور افتادہ علاقوں میں قیام پذیر عوام کی زندگی کے مسائل کو ناول میں جگہ دی گئی ہے۔ ان مظلوم افراد کو نظام سلطنت سے مکمل طور پر محروم رکھا جاتا ہے۔ ناول کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ کہ نمائندگان حکومت کا یہ خاص وصف ہے کہ وہ تمام ترقیاتی کام اپنے من پسند علاقوں میں ہی کروانا پسند کرتے ہیں۔ آج تک نفرت، ہتک اور استحصالی رویوں میں کوئی خاص تبدیلی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ چھوٹے چھوٹے علاقوں سے تعلق رکھنے والے یہ افراد سستی مزدوری کے لیے دور دور تک اسفار کرتے ہیں۔ ان کی زندگی مکمل طور پر بحران کا شکار دکھائی دیتی ہے۔ اقتباس:

"اس نے نیچے میدانوں میں رہ کر نفرتوں کینے اور حسد کے بہت تماشے دیکھے اور سنے تھے۔ ایسے کہ سننے والے کو اور دیکھنے والے کو یقین نہ آئے۔ اس نے کمینگی وحشت اور بربریت کے بہت قصے سنے تھے اور ان پر اسے حیرت بھی نہ ہوتی تھی"۔ (۱۲)

مجموعی طور پر اس دھرتی کے باشندوں کے ابتر حالات کے پس پردہ اس ملک کا ناپختہ سیاسی نظام کارفرما ہیں۔ یہ ادارہ اگر جمہوری اقدار پر کاربند رہتے ہوئے اپنی منصب کو نبھائے۔ تو حالات انسانی سوچ کے مطابق بدلے جا سکتے ہیں۔ وطن عزیز میں عام انسان کی زندگی بھی سہل ہو سکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ہنس راج رہبر، ترقی پسند ادب ایک جائزہ، آزاد کتاب گھر دہلی، ۱۹۶۸ء ، ص:۱۴۲

۲۔ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر، اردو ادب احتجاج اور مزاحمت کے رویے، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۴ص:۳۰۳

۳۔ صلاح الدین درویش، ڈاکٹر انسان دوستی (نظریہ اور تحریک)، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۷، ص:۲۳۲

۴۔ایضاً، ص:۲۳۴

۵۔ انور سجاد، ڈاکٹر، خوشیوں کا باغ، قوسین لاہور، ۱۹۸۱ء، ص: ۱۱۶

۶۔ایضاً، ص:۱۰۶

۷۔ محمد عارف، ڈاکٹر، اردو ناول میں آزادی کے تصورات، کوآپریٹو سوسائٹی لاہور، س۔ن، ص:۸۶۶

۸۔عبداللہ حسین، باگھ، قوسین لاہور، ۱۹۸۲ء ، ص:۳۶۹

۹۔ایضاً، ص:۱۴۷

۱۰۔ ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر (مرتب)، اردو ادب احتجاج اور مزاحمت کے رویے، ص: ۳۰۸

۱۱۔ صدیق سالک، پریشر ککر، مکتبہ سرمد راولپنڈی، ۱۹۸۳ء، ص:۸۸

۱۲۔الطاف فاطمہ، خواب گر، جمہوری پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۶ ، ص:۲۷۲